نکاح کے لئے عمر کا تعین، فقہ و قانون کی روشنی میں (اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کا شرعی جائزہ)

Fixation of the Minimum Age for Marriage in the Light of Fiqh and Law: A Sharīʿah Analysis of Apex Courts' Judgments

مقالہ نگار: ڈاکٹر عبدالکریم عثمان

اسسٹنٹ پروفیسر، کلیہ شریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
Email: abdul.karim@iiu.edu.pk

معاون مقالہ نگار: وقار احمد

پی، ایچ، ڈی اسکالر، شریعہ ڈیپارٹمنٹ، کلیہ شریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
Email: waqaralrazi141@gmail.com

Abstract

The issue of child marriage has long been discussed in classical Islamic jurisprudence and continues to be debated in contemporary legal and social contexts. This study examines the concept of marriage at a young age through the view of Islamic jurisprudence (Fiqh) and modern law, with particular attention to the conditions, objectives, and limitations set by Sharīʿah. The research analyzes classical juristic opinions regarding guardianship (wilāyah), maturity (rushd), consent, and the welfare of minors, highlighting the diversity of views among Islamic schools of thought. It further explores the distinction between the permissibility of contracting marriage and the legitimacy of consummation, as well as the role of judicial authority (the state/guardian) in regulating marriages to prevent harm and injustice. In addition, the study reviews contemporary decisions of some Pakistani courts regarding child marriage, especially statutory age limits, and evaluates their compatibility with the objectives of Islamic law (Maqāṣid al-Sharīʿah), particularly the protection of life, dignity, and rights of children. The article argues that Islamic jurisprudence provides sufficient principles to regulate marriage in a manner that safeguards welfare, prevents harm, and aligns with evolving social realities. The study concludes that harmonization between Islamic legal principles and modern legislation is both possible and necessary to address the challenges associated with child marriage.

***Keywords*:** Child Marriage; Islamic Jurisprudence; Nikāḥ; Wilāyah; Rushd (Maturity); Guardianship; Islamic Law and Modern Law; Maqāṣid al-Sharīʿah.

تعارف

عصرِ حاضر میں خاندانی نظام کو دو بڑے چیلنجز کا سامنا ہے۔ پہلا چیلنج عالمگیریت (Globalization) اور تیز تر سماجی روابط کے اثرات سے پیدا ہوا ہے، جنہوں نے افراد کے درمیان تعلقات کو پہلے سے کہیں زیادہ آسان اور قریب کر دیا ہے۔ اس رجحان نے مسلم معاشروں میں حتیٰ کہ نو عمر لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان بھی ناجائز تعلقات کے پھیلاؤ میں اضافہ کیا ہے، حالانکہ شریعت نے ایسے تعلقات کو سختی سے منع کیا ہے۔

دوسرا چیلنج شادی کے بڑھتے ہوئے مسائل ہیں جو سماجی، ثقافتی اور معاشی رکاوٹوں کی بنا پر ہیں۔ بڑھتے ہوئے اخراجات، والدین کی پابندیاں اور معاشرتی توقعات نے بہت سے نوجوانوں کے لیے جائز شادی کو انتہائی مشکل بنا دیا ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر کئی مسلم ریاستوں نے شادی کے لیے کم از کم قانونی عمر مقرر کرنے کے قوانین متعارف کرائے ہیں(1)۔ اگرچہ ان قوانین کا مقصد کم عمر بچوں کو تحفظ دینا اور خاندانی معاملات کو منظم کرنا ہے، لیکن بعض اوقات یہ قوانین ایسے افراد کے لیے رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں جو اسلامی طور پر بالغ ہیں اور جائز طریقے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے: کیا شادی کی عمر کے تعین سے متعلق ریاستی قانون شریعت کے مقاصد کے مطابق ہے یا یہ ناجائز تعلقات کی روک تھام میں رکاوٹ بن جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ نابالغ بچوں کے تحفظ اور نوجوانوں کے لیے جائز شادی کو آسان بنانے کے درمیان ایسا توازن قائم کیا جائے جو خاندانی نظام کو محفوظ رکھے اور اسلامی قانون کے اعلیٰ مقاصد (مقاصدِ شریعت) کو برقرار رکھے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام ایک اعتدال اور انصاف کا مذہب ہے، جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط، بلکہ اعتدال پر مبنی تعلیمات اسلام کا طرہ امتیاز ہے، اس بناپر اسلامی تعلیمات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کم عمری کی شادی کی اسلام میں ترغیب نہیں ہے ، البتہ کچھ خاص حالات میں، خاص شرائط کے ساتھ شریعت میں کم عمری کی شادی کی اجازت ملتی ہے ، اور اس شادی کو قبول کرنا صرف اور صرف لڑکا، لڑکی کے مستقبل کے تحفظ اور مضبوط رشتے کی بنیاد استوار کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

کم عمری کی شادی کا بنیادی مقصد ہوتا ہے کہ جب کوئی مناسب اور ہم پلہ رشتہ مل جائے اور اندیشہ ہو کہ یہ موقع ضائع ہو سکتا ہے، تو اسلام خاص طور پر والد یا دادا کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ شادی کرا دیں، چاہے بچہ کم عمر ہی کیوں نہ ہو(2)۔

یہ بات نہایت اہم ہے کہ شریعت نے فیصلہ کرنے کی ذمہ داری خاص طور پر والد اور دادا پر ڈالی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اس معاملے کو کتنی حساسیت سے دیکھتا ہے اور کس قدر حفاظت کے ساتھ اس ذمہ داری کو نبھانے کی ترتیب بناتا ہے۔ اسی لیے یہ ہدایت ہے کہ جب مناسب اور ہم پلہ رشتہ میسر آجائے تو کم عمری میں بھی نکاح ہو سکتا ہے۔

مزید یہ کہ اسلام نے یہ اختیار کسی عام شخص کو نہیں دیا، بلکہ صرف قریبی مرد رشتہ داروں (عَصَبہ) کو دیا ہے۔ اور ان میں بھی صرف ان کو جو زیادہ رحمدل اور خیر خواہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر والد یا دادا نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح کریں تو ان کو یہ نکاح توڑنے کا حق حاصل نہیں، کیونکہ والد اور دادا بچوں کے معاملے میں سب سے زیادہ شفیق اور دور اندیش ہوتے ہیں، اور اگر یہ نکاح ان کے علاوہ کسے اور نے کیا ہو تو ان کو خیار بلوغ حاصل ہوتا ہے(3)۔ یہ گفتگو اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ شریعت کا مقصد نابالغ بچوں کی مصلحت (مصلحتِ صغیر) کو ملحوظ رکھنا اور ازدواجی تعلق کی پائیداری کو یقینی بنانا ہے۔

اسلام کا مقصد میاں بیوی دونوں کے لیے خوشحال اور پرامن زندگی قائم کرنا ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نابالغ کی شادی والد یا دادا صرف اسی وقت کریں گے جب اس میں حقیقی فائدہ ہو۔

البتہ اگر کوئی فائدہ واضح طور پر نہ ہو یا والد یا دادا کی طرف سے غفلت یا اختیار کا غلط استعمال ظاہر ہو تو اسلام ایسی شادی کو کسی صورت جائز قرار نہیں دیتا۔ امام سرخسیؒ نے اس بارے میں کہا ہے کہ نابالغ کی شادی اسی وقت درست ہے جب اس میں مصلحت پائی جائے اور لڑکے یا لڑکی کے لیے مناسب رشتہ ہو(4)۔

امام شافعیؒ نے یہ شرائط بیان کی ہیں کہ ایک والد اپنی کم عمر کنواری بیٹی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر کب کر سکتا ہے۔ وہ شرائط یہ ہیں:

أ. والد اور بیٹی کے درمیان کوئی کھلی دشمنی نہ ہو۔

ب. والد بیٹی کا نکاح کسی ایسے شخص سے کرے جو اس کے لیے مناسب اور ہم پلہ (کُفُو) ہو۔

ج. مہر مثل پر نکاح ہو یعنی حق مہر ایسا ہو جو اس جیسی لڑکیوں کو دیا جاتا ہے۔

د. داماد اتنا غریب نہ ہو کہ مہر ادا نہ کر سکے۔

ہ. والد اپنی بیٹی کا نکاح ایسے شخص سے نہ کرے جو اسے نقصان پہنچا سکتا ہو، جیسے کوئی اندھا شخص یا بہت زیادہ بوڑھا آدمی۔

لہٰذا ولی پر لازم ہے کہ وہ ایسا شوہر منتخب کرے جو بیٹی کے قریب العمر ہو، تاکہ میاں بیوی میں ہم آہنگی قائم ہو اور ان کا رشتہ زیادہ پائیدار بن سکے([5])۔ پس اگر یہ شرائط پوری نہ ہوں تو فقہ اسلامی کی روشنی میں اس نکاح کی اجازت نہیں۔

نابالغ بچوں کی شادی کے لیے عمر مقرر کرنا

اوپر کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلامی قانون کا بنیادی مقصد نابالغ بچوں کے مفاد (مصلحت) کو یقینی بنانا ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں جب کوئی واضح مصلحت نہ ہو، نکاح نہ تو درست سمجھا جائے گا اور نہ ہی اخلاقی طور پر مناسب۔

فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ کم عمری میں بھی نکاح درست ہے اگر وہ سرپرستوں کی جانب سے کیا جائے۔ البتہ مباشرت (جنسی تعلقات) کے بارے میں یہ شرط ہے: اگر لڑکی جسمانی طور پر جنسی عمل کرنے کے قابل نہ ہو تو شوہر کو اس کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ اس قابل ہے اور بیماری یا نقصان کا اندیشہ نہیں تو ایسی صورت میں شوہر کو اجازت دی جائے گی([6])۔

اگر نکاح والد یا دادا کے علاوہ کسی رشتہ دار نے کیا ہو تو نابالغ بچوں کو بلوغت کے بعد نکاح منسوخ کرنے کا اختیار (خِیارُ البلوغ) ہوتا ہے، اور اگر یہ نکاح والد یا دادا کی طرف سے ہو تو پھر بلوغت کے بعد نکاح منسوخ کرنے کا اختیار (خِیارُ البلوغ) نہیں ہوتا۔ یہ کم عمری کے نکاح کا اختیار اس بنیاد پر ہے کہ اولیاء (سرپرست حضرات) عموماً بچے کی بھلائی کو مد نظر رکھتے ہیں، اور اس کے حقوق کی حفاظت و نگہداشت کرتے ہیں، تاہم یہ اختیار مطلق نہیں ہے۔

لہٰذا اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ ولی نے بچے کے مفاد کا لحاظ نہیں رکھا، بلکہ اپنی ذاتی غرض اور محض اپنے مفادات کے حصول کے لئے، بچے کی مصلحت کو نظر انداز کر کے نکاح کیا ہے، تو شریعت نے قاضی (جج) کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ ایسے نکاح کو کالعدم قرار دے کر بچے کے حقوق کی حفاظت کرے([7])۔ کیونکہ کم عمری کی شادی صرف اس لیے جائز رکھی گئی ہے کہ اگر کوئی مناسب رشتہ مل جائے اور اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ولی کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ نکاح کر سکے([8])۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کم عمری کی شادی میں کئی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں، جیسے لڑکے اور لڑکی کے بڑے ہونے کے بعد ایک دوسرے کو ناپسند کرنا، یا دونوں میں سے کسی کو بیماری لاحق ہونا جسے دوسرا برداشت نہ کر سکے۔ آج کے دور میں خاص طور پر یہ مسئلہ بڑھ گیا ہے کہ اولیاء بسا اوقات اپنی ذاتی مفاد کو بچوں کی مصلحت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس صورت میں سوال یہ ہے کہ ایک کم عمر لڑکی کو عمر بھر کی آزمائش سے بچانے کے لیے کیا متبادل طریقہ اختیار کیا جائے؟

ایک ممکنہ حل یہ ہے کہ قانون میں واضح طور پر درج کیا جائے کہ بلوغت سے پہلے نکاح صرف اسی وقت جائز ہے جب یہ بچے کی واضح مصلحت میں ہو،

اور لڑکی کے علم میں یہ لایا جائے کہ اسے بلوغت کے بعد "خِیارُ البلوغ" (نکاح منسوخ کرنے کا حق) حاصل ہے، خاص طور پر اگر وہ نکاح والد یا دادا کے علاوہ کسی اور نے کیا ہو۔ اور لڑکی کو ہر ممکن سہولت فراہم کی جائے کہ وہ اس حق کو استعمال کر سکے۔ لیکن کیا یہ زیادہ بہتر نہ ہو گا کہ بلوغت سے پہلے نکاح کو مکمل طور پر ممنوع قرار دے دیا جائے، تاکہ کچھ سرپرست لڑکیوں کی زندگیاں برباد نہ کر سکیں؟

کیا ایک مسلم حکمران، جو لوگوں پر عام ولایت (ولایہ عامہ) رکھتا ہے، اولیا کے اختیارات پر ایسی شرائط یا پابندیاں عائد نہیں کر سکتا جو بچیوں کے حقوق اور فلاح و بہبود کے تحفظ کے لیے ہوں؟ حکمران کو یہ اختیار حاصل ہے کہ مباح (جائز) امور میں عوامی مفاد کے تحفظ کے لیے قانون سازی اور ضابطے کرے۔ معاشرے کی حالت اور حالات کے مطابق وہ جائز کاموں پر مناسب پابندیاں بھی لگا سکتا ہے، خاص طور پر کمزور اور مظلوم طبقے کے تحفظ کے لیے۔

ضرورت پڑنے پر وہ وقتی طور پر ایسے افعال پر پابندی بھی عائد کر سکتا ہے۔ یہ اصول فقہاء نے "مصالح مرسلہ" (غیر مقید عوامی مفادات) کے باب میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ امام محمدؒ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ایک مثال نقل کی ہے کہ آپؓ نے فرمایا" :اگر کوئی لڑکی اپنے ہم پلہ کے علاوہ کسی اور سے نکاح کرے گی تو میں اسے روک دوں گا([9])".

امام سرخسیؒ اس کی قانونی بنیاد بیان کرتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ معاشرتی مفاد کا تحفظ حکمران کی ذمہ داری ہے، اور اسی ذمہ داری کی وجہ سے حکمران کو نکاح جیسے معاملات میں بھی ضابطہ سازی کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ اس کی شرح و تفصیل کرتے ہوے امام سرخسی نے ذکر کیا ہے:

"وفي هذا دليل على أن للسلطان يداً في الأنكحة فقد أضاف المنع إلى نفسه، وذلك يكون بولاية السلطنة"([10]).

اس عبارت میں اس بات کی دلیل ہے کہ نکاح کے معاملات میں سلطان (حاکمِ وقت) کا بھی ایک حد تک اختیار اور دخل ہوتا ہے، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے نکاح سے روکنے کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے، اور اس قسم کے اختیار کا استعمال ولایتِ سلطنت کے تحت ہوتا ہے۔ لہٰذا ریاست بلوغت سے پہلے نابالغ کی شادی کو روک سکتی ہے، جیسا معروف عرب عالم شیخ ابن عثیمینؒ نے بھی فرمایا ہے([11])۔

اس موقع پر ان فقہاء کی رائے کو بھی بطور دلیل قبول کیا جا سکتا ہے جو کم عمری کی شادی کے قائل نہیں اور نابالغ کی شادی کو جائز نہیں سمجھتے . جیسے ابن شُبرُمہ، عثمان البتّی اور ابو بکر الاصمؒ۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ نہ لڑکا اور نہ لڑکی، دونوں کو بلوغت سے پہلے شادی نہیں کرنی چاہیے ([12])۔

اس طرح اگر آج کے معاشرے کی اخلاقی حالت اور سرپرستوں کی غفلت کو دیکھا جائے تو اگر قانون بلوغت سے پہلے شادی پر پابندی عائد کرتا ہے تو یہ درست اور شریعت کے مطابق ہے([13])۔ یہ کسی جائز چیز کو حرام قرار دینا نہیں بلکہ اس کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے ضابطہ سازی ہے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ شریعت ولی (سرپرست) کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ بلوغت سے پہلے نابالغ لڑکی کا نکاح کرے، بشرطیکہ وہ اس کی مصلحت کو مد نظر رکھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شریعت حکمرانوں پر یہ ذمہ داری بھی عائد کرتی ہے کہ وہ ایسی بچیوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ لہٰذا اگر حکمران یہ مناسب سمجھے کہ ولی کے اختیار کو محدود یا وقتی طور پر معطل کر دیا جائے، تو وہ ایسا "سیاستِ شرعیہ" (اسلامی طرزِ حکمرانی) کے دائرے میں رہتے ہوئے باضابطہ قانون سازی کے ذریعے کر سکتا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل (CII) کی اس بارے میں ایک سفارش ہے کہ:

"بچوں اور بچیوں کو مکمل آزادی دینا کہ وہ اپنی خواہشات اور جذبات کے مطابق شادیاں کریں، شریعت کے واضح نصوص کے خلاف ہے۔ اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ اولیا (سرپرست) محض اپنی مرضی سے، بچوں سے مشورہ لیے بغیر ان کا نکاح کر دیں"۔

لہٰذا ایسے بچے جو ابھی رضامندی یا بامعنی مشورہ دینے کی عمر کو نہیں پہنچے، ان کے لیے یہ حق ہونا چاہیے کہ بلوغت کو پہنچنے کے بعد "خِیارُ البلوغ" (نکاح کو ختم کرنے کا اختیار) استعمال کر سکیں([14])۔

بعض فقہاء کے نزدیک یہ اختیار مطلق طور پر دیا جا سکتا ہے، جبکہ بعض اسے صرف اس صورت میں جائز سمجھتے ہیں جب ولی نے اپنے اختیار کا غلط استعمال کیا ہو (سوء الاختیار) یا اس نکاح سے کوئی نقصان (مفسدہ) پیدا ہونے کا اندیشہ ہو([15])۔ اس بنا پر دو تجاویز سامنے آتی ہیں:

1- اولیاء کو نابالغ بچوں کا نکاح کرنے سے روکا جائے، اور اس کے بجائے صرف منگنی (وعدہ نکاح) کی اجازت دی جائے، کیونکہ منگنی نکاح سے مختلف ہے۔

2- یہ اجازت دی جائے کہ اولیاء بچوں کا نکاح کر سکتے ہیں، لیکن اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ اختیار کا غلط استعمال ہوا ہے یا اس کے نتائج نقصان دہ ہیں، تو بچے کو بلوغت کے بعد "خِیارُ البلوغ" کا حق دیا جائے([16])

یہ بات واضح رہے کہ اوپر کی ساری گفتگو بلوغت سے پہلے کے نکاح کے بارے میں تھی۔ جہاں تک بلوغت کے بعد کے نکاح کا تعلق ہے، اس پر مفصل گفتگو بعد میں ہو گی، تاہم اس سے پہلے چند نہایت اہم نکتوں کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، جن کو مندرجہ ذیل عدالتی فیصلوں میں اٹھایا گیا۔

اسلام آباد ہائی کورٹ کے فیصلے

فیصلہ نمبر1: مسماۃ ممتاز بی بی بنام قاسم و دیگر (رٹ پیٹیشن نمبر4227 مجریہ 2021ء)

اس فیصلے کے پارہ نمبر39 اور40 میں صراحۃ مذکور ہے کہ 18 سال سے کم عمر میں اگر شادی ہو گی تو وہ منعقد ہی نہیں ہو گی اور ایسا نکاح باطل تصور ہو گا([17])۔

فیصلہ نمبر2: عبد الرزاق بنام سرکار و دیگر (2022 پی سی آر ایل جے 953 - اسلام آباد)

اس فیصلے میں عدالت نے وفاقی شرعی عدالت کے ایک فیصلے کو بنیاد بنایا ہے، فاضل جج پارہ نمبر میں رقمطراز ہیں:

"شریعتِ اسلامیہ کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ اگر کوئی مباح (جائز) عمل اجتماعی طور پر معاشرے یا اس کے کسی خاص طبقے کے لیے مضر ثابت ہو رہا ہو، تو ریاست کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس عمل کو ممنوع قرار دے دے، تاکہ معاشرے کو کسی بڑے ضرر سے محفوظ رکھا جا سکے۔ تاریخ میں اسلامی ریاست کی جانب سے اٹھائے گئے اس قسم کے اقدامات کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

اس کی ایک واضح مثال خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ اقدام ہے جس میں آپ نے اہلِ کتاب خواتین (کتابیات) سے نکاح کو ممنوع قرار دیا۔ اگرچہ شرعی رو سے یہ عمل قانونی (جائز) اور مباح ہے، لیکن اس دور میں اسلامی ریاست اور مسلم امہ کے وسیع تر مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آپ نے ان شادیوں پر پابندی عائد فرمائی۔ مزید برآں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے متعدد ایسے اقدامات بھی کیے جن میں آپ نے مخصوص حالات کے تحت کسی مباح عمل پر احتیاطی تدابیر کے طور پر اس انداز میں قدغن لگائی کہ اس سے شریعت کا کوئی دوسرا حکم متاثر نہ ہو۔ لڑکیوں کے لیے (نکاح کی) کم از کم عمر ۱۶ سال مقرر کرنا بھی انہی مثالوں میں سے ایک ہے۔([18])

مزید برآں فاضل جج نے لکھا ہے کہ جس طرح مالی معاملات کی لیے عقل کے ساتھ رشد ضروری ہے اسی طرح نکاح کی لیے بھی ضروری ہے، لکھتے ہیں:

"نکاح کے انعقاد کے لیے محض 'بلوغت' ہی کافی نہیں، بلکہ 'رُشد' وہ دوسرا اہم معیار ہے جو اس کے لیے ضروری ہے۔ ہنس ویئر (Hans Wehr) کی 'جدید تحریری عربی لغت' (Dictionary of Modern Written Arabic) کے مطابق لفظ 'رُشد' کی تعریف یوں کی گئی ہے: افعال کی

درستگی، موزوں اور دانشمندانہ طرزِ عمل، عقل، فہم و فراست، شعور اور (ذہنی) پختگی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عقدِ نکاح صرف وہی شخص منعقد کر سکتا ہے جو سنِ بلوغ کو پہنچ چکا ہو اور ساتھ ہی درست فیصلہ سازی کی صلاحیت اور ذہنی پختگی کا بھی حامل ہو([19])۔"

مذکورہ بالا عدالتی فیصلوں پر تبصرہ:

پہلی بات یہ ہے کہ فاضل جج نے رشد والی بات مولانا مودودی صاحب کی تفسیر "تفہیم القرآن" کے حوالے سے نقل کی ہے، جبکہ مولانا مودودی نے اپنی تفسیر میں کہیں بھی یہ بات نہیں کہی کہ نکاح کی لیے رشد کی ضرورت ہے، تفہیم القرآن کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

" مال ان کے حوالے کرنے کے لیے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں: ایک بلوغ، دوسرے رشد، یعنی مال کے صحیح استعمال کی اہلیت([20])"۔

دوسری بات یہ ہے کہ رشد کے حوالے سے معتبر اور معروف تفاسیر کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی کہ مفسرین میں سے کسی نے یہ بات ثابت نہیں کی کہ نکاح کی لیے "رشد" شرط اور ضروری ہے، بلکہ مفسرین نے رشد کو صرف مالی معاملات کی لیے ہی ضروری قرار دیا ہے، ذیل میں کچھ تفاسیر کے اقتباسات پیش ہیں:

مشہور مفسر امام زمخشری تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں:

"فإن قلت: ما معنى تنكير الرشد؟ قلت: معناه نوعا من الرشد وهو الرشد فى التصرف والتجارة، أو طرفا من الرشد ومخيلة من مخايله حتى لا ينتظر به تمام الرشد"([21])

تفسیر مظہری میں ہے:

"قال أبو حنيفة تنكير رُشْداً في الآية يفيد التقليل يعني نوعاً من الرشد حتى لا ينتظر به تمام الرشد"([22])

تفسیر مدارک میں ہے:

"وتنكير الرشد يفيد أن المراد رشد مخصوص وهو الرشد في التصرف والتجارة"([23])

رشد کے حوالے سے امام شوکانی رحمہ اللہ نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں، لکھتے ہیں:

اہلِ علم کے درمیان یہاں "رُشد" کے معنی میں اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ کہا گیا ہے: رُشد سے مراد عقل اور دین دونوں میں درستگی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رُشد سے مراد صرف عقل کی درستگی ہے۔ سعید بن جبیر اور شعبی کہتے ہیں کہ یتیم کو اس کا مال اس وقت تک نہیں دیا جائے گا جب تک اس میں رُشد ظاہر نہ ہو، چاہے وہ بوڑھا ہی کیوں نہ ہو۔ ضحاک کہتے ہیں: اگرچہ وہ سو برس کا ہو جائے۔ اور جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ رُشد بلوغت کے بعد ہی پایا جاتا ہے، اور یہ کہ اگر رُشد ثابت نہ ہو تو اس سے پابندی (حَجر) ختم نہیں ہوتی۔ جبکہ امام ابو حنیفہ، نخعی اور زفر رحمہم اللہ کے نزدیک آزاد بالغ شخص پر پابندی نہیں لگائی جائے گی، چاہے وہ فاسق ہو یا فضول خرچ ہی کیوں نہ ہو([24])۔

اس مسئلے میں تیسرا قول، امام شوکانی رحمہ اللہ نے ذکر نہیں کیا۔ اس قول کے مطابق رُشد (بالغ ہونے کے بعد معاملہ فہمی) کا معیار عقل اور مال میں حسنِ تصرف ہے۔ اس قول کو ابن العربی نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے، اور ابن العربی نے اسی قول کو قوی قرار دیا ہے۔ اسی طرح امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے بھی اسے ترجیح دی ہے، اور اسی مفہوم کے قریب ایک قول انہوں نے ابن عباسؓ سے بھی روایت کیا ہے۔ امام قرطبی نے بھی اس قول کو میں سدی اور سفیان ثوری سے نقل کیا ہے۔

اس قول اور پہلے قول کے درمیان فرق یہ ہے کہ پہلے قول کے مطابق "صلاح" سے مراد دینی صلاحیت ہے، جبکہ تیسرے قول کے مطابق اس سے مراد مالی معاملات میں درستگی اور حسنِ تصرف ہے([25])۔

لہذا یہ بات کہنا کہ نکاح کی لیے رشد ضروری ہے اس کی کوئی مضبوط بنیاد یا دلیل نہیں۔

پاکستان کی وفاقی شرعی عدالت کا ایک فیصلہ

مقدمہ :فاروق عمر بھوجا بنام فیڈریشن آف پاکستان)شرعی درخواست نمبر10/1برائے2020

اس فیصلے میں کہا گیا ہے کہ:

"یہ اصولِ شریعت میں طے شدہ ہے کہ اگر کوئی مباح (جائز) عمل ایسا نظر آئے جو مجموعی طور پر معاشرے کے لیے یا اس کے کسی خاص طبقے کے لیے نقصان دہ ہو تو ریاست کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس عمل کو ممنوع قرار دے۔

تاکہ معاشرے کو بڑے نقصان سے بچایا جاسکے۔۔۔لڑکی کے لیے شادی کی کم از کم عمر16 سال مقرر کرنا اسی اصول کی ایک مثال ہے۔([26])

فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے پر تبصرہ:

معزز عدالت نے مختلف دلائل پر انحصار کیا، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اگرچہ زیادہ تر مسلم فقہاء کی رائے یہ ہے کہ نابالغ لڑکی کا نکاح جائز ہے، لیکن کچھ دیگر فقہاء اس کے مخالف ہیں۔ مثال کے طور پر امام ابن شُبرُمہ اور قاضی ابو بکر الاصم، جو امام ابو حنیفہؒ کے ہم عصر تھے، ان کا مؤقف تھا کہ ایسا نکاح اسلام میں جائز نہیں([27])۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقہاء کے درمیان دونوں آراء موجود ہیں۔ لہٰذا شادی کی عمر18 مقرر کرنا بھی اسلامی ہے۔

اس موقع پر میں ایک اہم فرق واضح کرنا اور سمجھنا ضروری ہے، بنیادی طور پر یہاں دو الگ الگ مسائل ہیں:

1. بلوغت سے پہلے شادی
2. بلوغت کے بعد لیکن18 سال سے کم عمر میں شادی۔

پہلے مسئلے پر اوپر تفصیل سے بات ہو چکی ہے، جہاں یہ واضح کیا گیا کہ اکثر فقہاء نابالغی (بلوغت سے پہلے) میں نکاح کو دلائل کی بنیاد پر جائز قرار دیتے ہیں۔ تاہم اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ بلوغت سے پہلے ہرگز مباشرت (ہمبستری) جائز نہیں۔ مباشرت صرف اس وقت جائز ہے جب لڑکی جسمانی طور پر اس کے قابل ہو۔

اختلاف صرف اس حد تک ہے کہ بعض علماء مثلاً ابو بکر الاصم وغیرہ اس کے قائل نہیں کہ بلوغت سے پہلے نکاح ہو سکتا ہے۔ لیکن بلوغت کے بعد شادی کے جواز پر تمام فقہاء متفق ہیں، اس پر کوئی اختلاف نہیں۔

اب عدالت نے ان دونوں مسائل کو آپس میں خلط ملط کر دیا ہے۔ اس نے نابالغی میں شادی سے متعلق فقہاء کے اختلاف کو بلوغت کے بعد (لیکن18 سال سے پہلے) کے نکاح پر بھی لاگو کر دیا ہے۔ اس طرح معزز عدالت نے بالواسطہ Child Marriage Restraint Act 1929 کو جائز قرار دے دیا۔ مثال کے طور پر جب عدالت نے یہ کہا کہ لڑکی کے لیے16 سال کی عمر مقرر کرنا اسلامی ہے، تو اس کا مطلب بالواسطہ یہ نکلتا ہے کہ لڑکوں کے لیے18 سال کی عمر بھی اسلامی ہے، حالانکہ یہ غیر اسلامی اور غیر شرعی ہے۔

بلوغت کے بعد لیکن18 سال سے کم عمر میں شادی کی عمر مقرر کرنا

اب یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ شریعت کے مطابق بلوغت کے بعد نکاح جائز ہے، جب وہ اپنی تمام شرائط پوری کرتا ہو، اور اس بارے میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب فقہاء اس پر متفق ہیں کہ جب کوئی لڑکا یا لڑکی بلوغت کو پہنچ جائے تو وہ نکاح کا عقد کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ فقہائے احناف کے نزدیک وہ ولی کی اجازت کے بغیر بھی نکاح کر سکتے ہیں۔ اسلامی شریعت میں نکاح کی کوئی خاص عمر مقرر نہیں کی گئی۔ کئی احادیث نوجوانوں کو اس بات کی ترغیب دیتی ہیں کہ جیسے ہی وہ جسمانی اور مالی طور پر اہل ہو جائیں، نکاح کر لیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ:

کیا شریعت ریاست کو یہ اجازت دیتی ہے کہ وہ نکاح کی ایک خاص عمر مقرر کرے اور اس عمر سے پہلے نکاح کو جرم قرار دے؟

اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے چند اہم نکات پر غور کرنا ضروری ہے:

کیا ریاست مباح (جائز) امور پر "تقیید المباح" (یعنی جائز امور پر عارضی پابندی لگانے) کے اصول کو لاگو کر کے نکاح کی عمر مقرر کر سکتی ہے؟

کیا یہ تعین اسلامی قانون کی بنیاد پر ہے یا محض مغربی انسانی حقوق کے تصورات پر؟

پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل (CII) کی اس حوالے سے کیا سفارشات ہیں؟

اس تعین کے ممکنہ نقصانات کیا ہیں؟

18 سال سے پہلے شادی کرنے کے نقصانات کیا ہیں اور ان کے مناسب حلول کیا ہیں؟

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شریعت کسی کو بلوغت کے فوراً بعد نکاح پر مجبور نہیں کرتی، بلکہ صرف اس کی ترغیب دیتی ہے۔ اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ 18 سال سے پہلے شادی نقصان دہ ہے تو وہ چاہے تو 18 سال کے بعد شادی کرے۔ اسے اس بات کی اجازت ہے۔ اور اگر واقعی کسی کے لیے 18 سال سے پہلے نکاح نقصان دہ ہے تو شریعت اسے 18 سال کے بعد نکاح کرنے کا پابند کرے گی، کیونکہ شریعت کا مقصد انسانی جان کی حفاظت ہے۔ بلکہ فقہی لٹریچر میں جہاں نکاح کو عام حالات میں مسنون قرار دیا ہے، وہاں نکاح حقوق کی عدم ادائیگی کے گمان یا یقین کی صورت میں مکروہ یا حرام بھی بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ کتب فقہ میں ہے:

"نصَّ الفُقهاءُ على أنَّ النكاحُ يُكرَهُ في حالاتٍ:قالَ الحَنفيةُ: يُكرَهُ النكاحُ في حالةِ الخَوفِ مِنْ الجَورِ -أي الظُّلمِ-؛ لأنَّ النكاحَ شُرِعَ لِما فيهِ مِنْ تَحصينِ النَّفسِ ومَنعِها مِنْ الزِّنا، على سَبيلِ الاحتِمالِ وتَحصيلِ الثَّوابِ المُحتملِ بالوَلدِ الَّذي يَعبدُ اللهَ تعالَى ويُوحِّدُه، فإنْ تَعارضَ خَوفُ الوُقوعِ في الزِّنا لو لم يتزوَّجْ وخَوفُ الجَورِ لو تزوَّجَ قدَّمَ الثَّاني، فلا افتِراضَ بل يُكرَهُ؛ لأنَّ الجَورَ مَعصيةٌ مُتعلِّقةٌ بالعِبادِ، والمنعَ مِنْ الزِّنا مِنْ حُقوقِ اللهِ تعالَى، وحقُّ العَبدِ مقدَّمٌ عندَ التَّعارضِ؛ لاحتياجِه وغِنى المَولى تعالَى(28)

فقہاء نے تصریح کی ہے کہ بعض حالتوں میں نکاح مکروہ ہوتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک جب (لڑکے کو اپنے حوالے سے لڑکی پر) ظلم کا خوف ہو تو نکاح مکروہ ہے؛ کیونکہ نکاح اس مقصد کے لیے مشروع کیا گیا ہے کہ انسان اپنی نفس کی حفاظت کرے اور اسے زنا سے روکے۔ نیز اس میں ممکنہ طور پر اس کے نتیجے میں ہونے والی اولاد جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اس کی توحید کا اقرار کرے تو اس کی وجہ سے ثواب حاصل ہونے کی امید بھی ہوتی ہے۔ اگر نکاح نہ کرنے کی صورت میں زنا میں پڑ جانے کے خوف اور شادی کرنے کی صورت میں (بیوی پر) ظلم کرنے کا خوف جمع ہو جائیں تو حنفیہ کے نزدیک دوسرے خوف (یعنی ظلم کے خوف کے پہلو) کو ترجیح دی جائے گی۔ لہٰذا نکاح فرض نہیں ہو گا، بلکہ مکروہ ہو گا؛ کیونکہ ظلم بندوں سے متعلق گناہ ہے، جبکہ زنا سے بچنا اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے ہے۔ اور جب دونوں حقوق میں تعارض ہو تو بندے کا حق مقدم کیا جاتا ہے؛ کیونکہ بندہ محتاج ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ بلکہ اگر اس بات کا یقین ہو کہ لڑکا اپنی بیوی کے حقوق واجبہ (جس میں کھانے، پینے اور رہائش کے اخراجات شامل ہیں) ادا نہیں کر سکے گا تو نکاح کرنا مسنون تو کجا، نکاح کرنا جائز ہی نہیں۔ چنانچہ علامہ یاسر نجار نے مختلف فقہاء کے حوالے سے نقل کیا ہے:

"نصَّ الفُقهاءُ على أنَّ النكاحَ يَحرمُ في حالاتٍ:قالَ الحَنفيةُ: يَحرمُ النكاحُ إنْ تيقَّنَ الجَورَ، بأنْ يَخافَ الجَورَ بحيثُ لا يُمكِنُه الاحترازُ عنهُ؛ لأنَّ النِّكاحَ إنَّما شُرِعَ لمَصلحةٍ مِنْ تَحصينِ النَّفسِ وتَحصيلِ الثَّوابِ، وبالجَورِ يأثَمُ ويَرتكِبُ المُحرَّماتِ، فتَنعدمُ المَصالِحُ لرُجحانِ هذهِ المفاسِدِ.وقالَ المالِكيةُ: يَحرمُ النكاحُ على مَنْ لا يَخافُ العنَتَ -أي الوُقوعَ في الزِّنا- إذا لَم يتزوَّجْ وكانَ يُضرُّ بالمَرأةِ لعَدمِ قُدرته على الوَطءِ، أو لِعدمِ النَّفقةِ أو التكسُّبِ مِنْ حَرامٍ أو تأخيرِ الصَّلاةِ عن أوقاتِها لاشتِغالِه بتَحصيلِ نَفقتِها" ([29]).

" فقہاء نے تصریح کی ہے کہ بعض حالتوں میں نکاح حرام ہو جاتا ہے۔ احناف کے نزدیک اگر آدمی کو ظلم (جَور) کا یقین ہو، یعنی اسے اس قدر ظلم کرنے

کا اندیشہ ہو کہ وہ اس سے بچنے کی قدرت نہ رکھتا ہو، تو نکاح حرام ہے؛ کیونکہ نکاح تو اصل میں ایک مصلحت یعنی نفس کی حفاظت اور ثواب کا حصول کے لیے مشروع کیا گیا ہے، لیکن ظلم کی وجہ سے وہ گناہگار ہو گا اور حرام کاموں کا ارتکاب کرے گا، تو ایسی صورت میں یہ مصلحتیں مفاسد غالب آجانے کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہیں۔ اور مالکیہ کے نزدیک اس شخص کے لیے نکاح حرام ہے جسے نکاح نہ کرنے کی صورت میں گناہ - زنا) میں پڑنے-کا خوف نہ ہو، لیکن (یقین ہو کہ) نکاح کرنے کی صورت میں وہ عورت کو ضرر پہنچائے گا ، مثلاً ہم بستری کی قدرت نہ رکھنے، یا نفقہ ادا نہ کر سکنے، حرام کمائی ، یا اس کے نفقہ کی کوشش میں مشغول ہونے کے سبب نمازوں کو ان کے وقت سے مؤخر کرنے (کے گناہ) کی وجہ سے ۔

تو اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شریعت کا نکاح کی اجازت دینا ان بنیادی مصلحتوں اور حکمتوں کے پیش نظر ہے جن کا تذکرہ ہوا، اگر وہ مصلحتیں یقینی طور پر فوت ہو رہی ہوں تو پھر عمر کی کوئی قید نہیں، ہر عمر میں نکاح مکروہ یا ممنوع قرار پائے گا۔

اب ہم آئندہ سطور میں نکاح کے لئے عمر کے تعین کے مسئلے کے حوالے سے چند علمی و اصولی مباحث کا تذکرہ کرتے ہیں.

نکاح کی عمر کا تعین اور تقیید المباح کا اصول

نکاح کی عمر کے تعین کے سلسلے میں یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ بلوغت کے بعد کسی بھی وقت نکاح کرنا ایک مباح عمل ہے اور اس پر کوئی اختلاف نہیں۔ تاہم اگر کوئی مباح عمل معاشرے کے لیے مجموعی طور پر یا اس کے کسی طبقے کے لیے نقصان دہ نظر آئے، تو حاکم یا ریاست کو یہ اختیار ہے کہ وہ اسے ممنوع قرار دے۔ اس اعتبار سے شادی کے لیے ایک عمر مقرر کرنا اور اس سے کم عمر میں نکاح پر پابندی لگانا شرعی طور پر بھی جائز ہو گا۔

اس حوالے سے سمجھنا چاہیے کہ اسلامی قانون نے حاکم (ولی الامر) کو بلند مقام دیا ہے، اس کی اطاعت کا حکم دیا اور نافرمانی کو ممنوع قرار دیا، تاکہ لوگوں کے اجتماعی معاملات درست رہیں اور وہ اپنے اس بڑے مقصد کو پورا کر سکیں جس کے لیے اسے حاکم مقرر کیا گیا ہے۔ تعیین حاکم کا مقصد دو بنیادی امور پر مشتمل ہے:

أ. دین کی حفاظت اور اسے اس کی بنیادوں پر قائم رکھنا۔

ب. دنیاوی امور کی تدبیر اور ریاست و شہریوں کے معاملات کو دین کے مطابق چلانا۔

اسلامی قانون نے ولی الامر کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ اپنے اس اہم فریضے کی ادائیگی کے لیے ہر ممکن اقدام، فیصلہ یا قانون سازی کرے۔ اس میں اسے یہ لچک دی گئی ہے کہ وہ اہل علم اور تجربہ کار ماہرین سے مشورے کے بعد حالات کو دیکھتے ہوئے فیصلے کرے۔ ان فیصلوں میں کسی چیز کو عارضی طور پر ممنوع یا لازم قرار دینا بھی شامل ہے، بشرطیکہ یہ سب کچھ شریعت کے دائرے میں رہے اور اس کی قطعی تعلیمات کے خلاف نہ ہو۔ اس ضمن میں فقہاء نے ایک معروف قاعدہ ذکر کیا ہے:

"تصرف الإمام على الرعية منوط بالمصلحة ([30])"

یعنی حاکم کے فیصلے رعایا کی مصلحت سے وابستہ ہیں۔

مصلحت کے بارے میں امام غزالیؒ کی وضاحت

امام غزالیؒ کے نزدیک "مصلحت (Interest/Benefit) "کا مطلب ہے کسی اچھی چیز کو حاصل کرنا یا کسی نقصان سے بچنا۔ لیکن یہاں اس سے مراد عام لوگوں کی خواہشات نہیں ہیں، کیونکہ نفع حاصل کرنا اور نقصان سے بچنا تو ہر انسان کا ذاتی مقصد ہوتا ہے۔ اصل "مصلحت "اسلام میں وہ ہے جس کو شریعت نے محفوظ کرنے کا حکم دیا ہے ([31])، جن کو مقاصد شریعت کا عنوان دیا گیا ہے اور وہ پانچ بنیادی چیزوں کی حفاظت ہے:

1. دین کی حفاظت (حفظ الدین)
2. جان کی حفاظت (حفظ النفس)
3. عقل کی حفاظت (حفظ العقل)
4. نسل / اولاد کی حفاظت (حفظ النسل)
5. مال کی حفاظت (حفظ المال) ([32])".

جو چیز ان پانچ کی حفاظت کرے وہ حقیقی مصلحت ہے، اور جو ان میں سے کسی کو نقصان پہنچائے وہ "مفسدہ" ہے۔ اس نقصان کو روکنا بھی مصلحت ہے۔ اسی لیے یہ قاعدہ کہتا ہے کہ جو شخص عوامی امور کی ذمہ داری سنبھالے، چاہے وہ حاکم ہو یا جج، اس کے فیصلے اسی وقت معتبر ہوں گے جب وہ حقیقی مصلحت اور عوامی فائدے پر مبنی ہوں۔ یہ فائدہ دینی ہو یا دنیاوی، دونوں صورتوں کو شامل ہے۔

پس اگر کسی حاکم کا فیصلہ عوام کے لیے دنیاوی فائدہ لاتا ہے تو اس پر عمل کیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ کسی حقیقی مصلحت پر مبنی نہ ہو تو پھر اس فیصلے کو رد کر دیا جائے گا۔

اگر اسلام میں کوئی چیز نہ تو سختی سے حرام ہے اور نہ ہی لازم، بلکہ صرف مباح (جائز) ہے، تو حاکم عوامی مفاد کی خاطر اسے وقتی طور پر لازمی بھی قرار دے سکتا ہے، یا اس پر پابندی بھی لگا سکتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حاکم مطلق العنان ہے اور وہ ہر مباح چیز پر جب چاہے پابندی لگا سکتا ہے۔ یہ اصول اتنا عام نہیں ہے جیسا کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔

کسی مباح کو کلی طور پر ممنوع قرار دینا شریعت سازی کے مترادف ہے، اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ کوئی انسان شریعت کے مستقل قوانین نہیں بنا سکتا۔ البتہ بعض صورتوں میں حاکم کو وقتی طور پر مشروط پابندی لگانے یا پھر اجازت دینے کا اختیار دیا گیا ہے، لیکن اس کے بھی حدود و قیود ہیں جنہیں فقہاء نے واضح کیا ہے، جسکی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

اُمور مباحہ کے بارے میں انتہائی اہم تقسیم:

مباح چیزوں کی دو قسمیں ہیں:

وہ جو قرآن و سنت کے نصوص سے جائز قرار دی گئی ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: " أحل الله البيع وحرم الربا "([33])،

"اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے"۔

اور نکاح وتعددِ ازواج کے بارے میں فرمایا: "فانكحوا ما طاب لكم من النساء مثنى وثلاث ورباع"[34]
"تمہیں جو عورتیں پسند آئیں ان سے نکاح کرو، دو، تین اور چار تک"۔
اس طرح کے منصوص مباحات کو کوئی شخص محدود نہیں کر سکتا، نہ لازمی بنا سکتا ہے اور نہ کلی طور پر روک سکتا ہے۔ وہ مباحات جن کا ذکر قرآن وسنت میں صراحت کے ساتھ نہیں آیا، لیکن ایک عمومی اصول کی وجہ سے وہ جائز ہیں، جیسے قاعدہ: "الأصل في الأشياء الإباحة[35] "، یعنی "چیزوں کا اصل حکم اباحت (جائز ہونا) ہے۔"
اس کی مثال قرآن کی یہ آیت ہے: "هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا [36] ،(ترجمہ) "وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لیے پیدا کیا"۔
لہٰذا مختلف قسم کی انواع واقسام کے کھانوں سے لطف اندوز ہونا، سردی وگرمی کے مختلف انداز کے کپڑے پہننا، چیزیں کرائے پر لینا دینا، آرام دہ مکانات بنانا، نت نئی سواریاں استعمال کرنا، وغیرہ وغیرہ، یہ سب اس عمومی اصول کی وجہ سے مباح ہیں۔
اب سوال یہ ہے کہ کیا حکمران کو اس دوسری قسم کی مباحات میں پابندی لگانے یا روکنے کا اختیار ہے؟ تو اس کا جواب ہے کہ جی ہاں، اگر عوامی مفاد کے لیے ضرورت ہو تو حکمران کو اختیار ہے کہ وہ ایسی مباح چیز پر پابندی عائد کرے یا اس میں شرائط لگا دے وغیرہ۔
رہی وہ چیزیں جو پہلی قسم کی ہیں جو قرآن یا سنت سے مباح (جائز) قرار دی گئی ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اگر کوئی چیز قرآن یا سنت میں مباح (جائز) قرار دی گئی ہے، جیسے کہ تجارت، نکاح، کھانے پینے کی چیزیں وغیرہ، تو پھر کسی کو یہ حق نہیں کہ اس پر پابندی لگائے (شرائط عائد کرے) لوگوں پر اسے لازمی کرے، یا اسے کلی طور پر روک دے۔ کیونکہ ایسا کرنا دین میں تبدیلی کے مترادف ہوگا، اور دین میں قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، قرآن وسنت دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، شریعت میں اصل قانون ساز صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے
فرمایا: "ألا إني أوتيت القرآن ومثله معه" ([37])". "مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی چیز بھی (یعنی سنت) عطا کی گئی ہے"۔
لہٰذا اصل اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کو کوئی نہیں روک سکتا، اور نہ ہی انہیں معطل کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں رکھی۔ البتہ اس عمومی اصول کی چند استثنائی صورتیں ہیں، لیکن وہ بھی وقتی اور ہنگامی حالات میں ہیں۔ اگر کوئی ضرورتِ شدیدہ یا عام مصلحت ہو اور اس کا کوئی دوسرا حل نہ ہو، تو اس صورت میں مباح چیز کو وقتی طور پر محدود یا معطل کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ فقہی قاعدہ ہے:
"الضرورات تبيح المحظورات([38])" ،یعنی "ضرورتیں ممنوع چیزوں کو بھی جائز کر دیتی ہیں"۔
اسی طرح دوسرا اصول ہے: "الحاجة تنزل منزلة الضرورة، عامة كانت أو خاصة ([39])" یعنی "ضرورت کو، خواہ عام ہو یا خاص، ضرورتِ شدیدہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔"
لیکن یہ پابندی یا تقیید صرف وقتی اور مخصوص حالات تک محدود ہوگی۔ جیسے ہی وہ حالات ختم ہو جائیں، حکم اپنی اصل حالت یعنی عمومی جواز کی طرف واپس آ جائے گا۔
البتہ یہ پابندی یا تقیید ہمیشہ وقتی اور محدود ہونی چاہیے، صرف اسی وقت تک جب تک وہ ضرورت باقی ہو۔ اسے مستقل یا عام قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ جیسے ہی وہ ضرورت ختم ہو، حکم واپس اپنی اصل حالت پر لوٹ آئے گا، یعنی عمومی اجازت ([40])۔

مقاصدِ شریعت کالحاظ

ہر وہ اقدام جو کسی مباح چیز پر پابندی یا اس کی تقیید سے متعلق ہو، اسے مقاصدِ شریعت (Objectives of Sharīʿah) کے حصول کے لیے ہونا چاہیے۔ شریعت کے یہ مقاصد لوگوں کی بھلائی اور فائدے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ امام شاطبیؒ فرماتے ہیں:

" ہم نے شریعت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ انسانوں کی مصلحت کے لیے بنائی گئی ہے (41)"۔

عوامی مفاد (المصلحة العامة) کالحاظ

اگر کوئی چیز قرآن یا سنت سے مباح ہے تو بھی حکمران اس پر عارضی پابندی لگا سکتا ہے بشرطیکہ واضح عوامی مفاد پایا جائے اور اہلِ علم کی مشاورت سے ہو۔ کیونکہ قاعدہ ہے: تصرف الإمام على الرعية منوط بالمصلحة(42) "یعنی" حاکم کے فیصلے رعایا کی مصلحت سے وابستہ ہیں"۔

البتہ اگر کوئی عوامی مفاد موجود نہ ہو تو مباح پر مستقل پابندی لگانا جائز نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پابندی کسی خاص صورت میں اور محدود وقت کے لیے ہو گی۔ اگر حکمران کسی ہنگامی حالت میں حکم جاری کرے تو یہ ہمیشہ کے لیے قانون نہیں بنے گا، بلکہ صرف اس حالت کے لیے ایک عارضی حکم ہو گا۔ جیسے ہی وہ حالت ختم ہو، حکم بھی ختم ہو جائے گا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سال کے دوران قربانی کے گوشت کو تین دن سے زیادہ ذخیرہ کرنے سے منع فرمایا۔ حالانکہ عام حالات میں گوشت ذخیرہ کرنا، کھانا یا تقسیم کرنا جائز ہے، لیکن اس سال ضرورت مند لوگ زیادہ تھے، اس لیے آپ ﷺ نے عارضی پابندی لگائی تاکہ سب کو گوشت میسر ہو۔ بعد میں جب حالات بہتر ہو گئے تو آپ ﷺ نے دوبارہ اجازت دے دی(43)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مباح چیز پر پابندی صرف ہنگامی اور عارضی حالات میں ہی جائز ہے، مستقل اور عام طور پر نہیں۔

مثالیں: مباح چیزوں پر شرائط لگا کر پابندی لگانا

1- تجارت

اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر تجارت کو جائز قرار دی، قرآن میں ہے، ترجمہ: "اللہ نے بیع (تجارت) کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا(44)"۔

لہٰذا کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تجارت صرف کچھ خاص اشیاء میں جائز ہے۔ تجارت صرف کچھ دنوں یا اوقات میں ہو سکتی ہے۔ تجارت صرف مخصوص مقامات پر ہو گی۔ یا تاجروں کو لازمی طور پر اپنی چیزیں بیچنی ہوں گی (زبردستی بیچنے پر مجبور کرنا)۔ اس قسم کی پابندیاں ان احکام کے خلاف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں جائز قرار دیے ہیں۔

2 : تعددِ ازواج (ایک سے زیادہ شادی کرنا)

قرآن و سنت میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت ہے(45)۔ لہٰذا کوئی حکومت یا فرد اسے کلی طور پر حرام نہیں قرار دے سکتا، نہ ہی ایسے قوانین بنا سکتا ہے جو لوگوں کو اس سے مستقل روکیں۔

البتہ اگر کوئی حقیقی ہنگامی صورتحال ہو، مثلاً عورتوں کی تعداد بہت کم ہو جائے، تو وقتی طور پر کچھ پابندیاں لگائی جا سکتی ہیں۔ لیکن جیسے ہی وہ حالات ختم ہوں، پابندی بھی ختم ہو جائے گی۔

3: نکاح پر پابندیاں

کوئی یہ قانون نہیں بنا سکتا کہ یونیورسٹی ڈگری رکھنے والی لڑکی کسی ایسے لڑکے سے نکاح نہ کرے جس کے پاس ڈگری نہ ہو۔ دیہات کے لوگ شہروں کے لوگوں سے شادی نہ کریں۔

یہ سب انسانی لگائی ہوئی پابندیاں ہیں اور ان امور کے خلاف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیے ہیں۔ اسی طرح کوئی یہ بھی لازم نہیں کر سکتا کہ ہر مرد اور عورت کو لازماً شادی کرنی ہے۔ نکاح سنت ہے، فرض نہیں۔

4: طلاق

اگرچہ طلاق کے بہت برے اثرات ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے جائز رکھا ہے([46])۔ اس لیے کوئی حکومت اسے کلی طور پر حرام قرار نہیں دے سکتی، نہ ہی اس پر عام پابندیاں لگا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کس چیز میں خیر ہے اور کس چیز میں شر۔ اس کے قوانین حکمت سے بھرپور ہیں۔

5 : کھانے پینے کی چیزیں

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے پاکیزہ کھانے پینے کی اشیاء کو جائز قرار دیا:

"اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دی ہیں ان میں سے کھاؤ"([47])۔

لہٰذا کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ: فلاں کھانے کی چیز مت کھاؤ، ایک دن یا ہفتے میں صرف اتنی مقدار کھاؤ، یا لوگوں کو زبردستی کچھ مخصوص کھانے کھلائے جائیں۔

البتہ اگر کسی وقت قحط ہو اور خوراک کم ہو تو حکمران وقتی طور پر یہ ضابطہ بنا سکتا ہے کہ ہر شخص کو ایک محدود مقدار ہی ملے، تاکہ سب کو کچھ نہ کچھ دستیاب ہو۔ جیسے ہی خوراک کی کمی دور ہو، یہ ضابطہ بھی ختم ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دی ہے، اس پر مستقل پابندی لگانا یا اسے لازمی کرنا کسی کے لیے جائز نہیں۔ صرف ہنگامی حالات میں، عوامی مفاد کی خاطر، وقتی طور پر کچھ حدود لگائی جا سکتی ہیں۔ لیکن جیسے ہی وہ ضرورت ختم ہو جائے، یہ پابندیاں بھی ختم ہو جانی چاہئیں۔

شادی کی کم از کم عمر مقرر کرنے کے مسئلے پر غور

اس وضاحت کے بعد جب ہم شادی کی عمر مقرر کرنے کے مسئلے پر غور کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نکاح ان معاملات میں شامل ہے جنہیں شریعت نے واضح نص کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ اس لیے یہ ایک عمومی قانون سازی ہے جس میں کسی کو مداخلت کا حق نہیں۔

اسلام میں شادی کی کوئی معین عمر مقرر نہیں ہے۔ جب بھی کوئی شخص نکاح کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے قابل ہو، جسمانی اور مالی طور پر فٹ ہو، اس کے لیے نکاح جائز ہے، چاہے وہ 18 سال سے کم ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا نکاح کی عمر کے لیے کوئی عمومی حد مقرر کرنا بغیر کسی شدید ضرورت یا ایمرجنسی کے، شریعت سازی کے مترادف ہے، اور یہ کسی کے لیے جائز نہیں۔

یہ رائے کہ حکمران کو نکاح کی کم از کم عمر مقرر کرنے کا حق حاصل نہیں، ایک مشہور فقہی قاعدے سے بھی تقویت پاتی ہے:

"الولاية الخاصة أقوى من الولاية العامة" ([48]).

یعنی "خصوصی ولایت (مثلاً باپ یا دادا کی ولایت) عام ولایت (مثلاً قاضی یا حکمران کی ولایت) سے زیادہ مضبوط ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ قریبی ولی (باپ یا دادا) کی اپنے بچوں پر ولایت عام حکام یا قاضی کی ولایت سے زیادہ قوی ہے۔ نکاح کے معاملات میں شریعت نے خاص طور پر قریبی رشتہ داروں، خصوصاً والد اور دادا کو اختیار دیا ہے۔ یہ اختیار ریاست کو نہیں دیا گیا۔ کیونکہ کوئی بھی والد یا دادا اپنی اولاد کے لیے دوسروں کی نسبت زیادہ محبت اور شفقت رکھتا ہے، اس لیے اسلام نے ان کو یہ خصوصی ولایت (ولایہ خاصہ) دی ہے۔

پس اگر کسی خاص صورتحال میں والد یا دادا یہ مناسب سمجھیں کہ لڑکے یا لڑکی کا کم عمری میں نکاح ہو جائے، تو حکمران کا فیصلہ ان کے فیصلے کو کالعدم نہیں کر سکتا، کیونکہ ولایہ خاصہ، ولایہ عامہ سے قوی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الزحیلی کہتے ہیں:

"جب ولایہ خاصہ اور ولایہ عامہ دونوں موجود ہوں تو خصوصی ولایت کو ترجیح دی جائے گی۔ عام ولی کا فیصلہ اس وقت مؤثر نہیں ہو گا جب حقیقی ولی موجود ہو۔ اگر عام ولی (قاضی یا حکمران) اس کے باوجود مداخلت کرے تو اس کا عمل درست نہیں ہو گا([49])۔

امام احمد بن محمد الزرقا فرماتے ہیں:

"وكذا لا يملك القاضي تزويج الصغار مع وجود الولي إلا بعد عضله" .([50])

یعنی "قاضی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ نابالغ بچوں کا نکاح کرے جب حقیقی ولی (باپ یا دادا) موجود ہو، سوائے اس صورت کے جب ولی نکاح سے انکار کر کے رکاوٹ ڈال رہا ہو"۔

اوپر کی وضاحت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حکمران یا قاضی کا مباح امور میں تصرف مطلق یا عام نہیں، بلکہ چند مخصوص شرائط اور حالات تک محدود ہے۔ حاکم یا قاضی کے پاس ولایت عامہ (عام سرپرستی) ہے، جبکہ باپ، دادا اور قریبی رشتہ داروں کے پاس ولایت خاصہ (خصوصی سرپرستی) ہے۔

اور جب ولایہ خاصہ موجود ہو تو ولایہ عامہ کا اختیار مؤثر نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے نکاح کا اختیار قریبی اولیاء کو دیا ہے کیونکہ وہ اپنی اولاد کے لیے سب سے زیادہ محبت اور رحمت رکھتے ہیں۔

اس حکمت کی بنیاد پر اسلام نے نکاح کے فیصلے افراد پر چھوڑ دیے ہیں تاکہ وہ جس عمر میں مناسب سمجھیں، شادی کر سکیں۔ اگر حکمران یا قاضی اس میں مداخلت کرے تو یہ لوگوں کی ذاتی زندگی میں خلل ڈالنے کے مترادف ہو گا۔ اس سے معاشرے میں مشکلات بڑھیں گی اور ایسے افراد بھی شادی نہ کر سکیں گے جنہیں فوری ضرورت ہے۔ یہ سراسر تنگی ہے، اور شریعت کا اصول ہے کہ لوگوں سے تنگی اور مشقت کو دور کیا جائے۔

اسی بنا پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حکمران کو نکاح کے لیے کوئی معین عمر مقرر کرنے یا اس بارے میں قانون بنانے کا حق نہیں۔ ہاں، اگر کسی خاص وقت یا حالات میں کسی خاص طبقے کے لیے عارضی طور پر پابندی لگانے کی ضرورت ہو تو وہ جائز ہے، لیکن اسے عمومی اور دائمی اصول نہیں بنایا جا سکتا۔

شادی کی عمر 18 سال مقرر کرنے کے نقصانات

نکاح کی کم از کم عمر 18 سال مقرر کرنے کے کئی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، جن میں چند درج ذیل ہیں:

1- شریعت کے خلاف مداخلت

اللہ تعالیٰ نے نکاح کو مباح قرار دیا ہے اور اس کی کوئی خاص عمر مقرر نہیں کی۔ جب بھی کوئی شخص نکاح کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قابل ہو، اس کے لیے نکاح جائز ہے۔ لہٰذا عمر مقرر کرنا شریعت میں مداخلت کے مترادف ہے۔

2- انسانی فطرت کے خلاف

انسان جب بلوغت کو پہنچتا ہے تو اس کے اندر فطری طور پر جنسی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر اس وقت نکاح کا راستہ بند کر دیا جائے تو یہ فطرت کے خلاف ہو گا، جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ نوجوان ناجائز تعلقات کی طرف مائل ہوں گے۔

3-زنا اور بے راہ روی کا پھیلاؤ

نکاح میں تاخیر اور اس پر پابندی کے نتیجے میں زنا اور ناجائز تعلقات بڑھیں گے، کیونکہ جب جائز راستہ بند ہو گا تو لوگ ناجائز راستہ اختیار کریں گے۔

4-والدین کے حقوق میں مداخلت

شریعت نے اولیاء، خصوصاً والد اور دادا کو نابالغ بچوں پر ولایت دی ہے۔ اگر ریاست نکاح کی عمر مقرر کر کے ان کے اختیار کو ختم کرے تو یہ والدین کے حق میں مداخلت ہے۔

5-خاندانی نظام پر منفی اثرات

نکاح کی عمر مقرر کرنے سے بہت سے نوجوان جو بلوغت کے بعد نکاح کے اہل ہوتے ہیں، وہ شادی نہیں کر سکیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ معاشرے

میں بے حیائی، فحاشی اور خاندانی بگاڑ عام ہو گا۔

6-شرعی اصول کے خلاف سخت سزائیں

پاکستان میں موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی 18 سال سے پہلے نکاح کرے تو یہ جرم ہے اور سزا کا باعث ہے۔ حالانکہ شریعت میں ایسا نکاح جرم نہیں بلکہ جائز ہے۔ اس طرح یہ قانون براہِ راست شریعت کے خلاف ہے۔

7-غربت اور جہیز کے مسائل میں اضافہ

جب نکاح میں تاخیر ہو گی تو شادی کے اخراجات بڑھ جائیں گے، جہیز کے بوجھ میں اضافہ ہو گا اور والدین کے لیے بیٹیوں کی شادی مشکل تر ہو جائے گی۔

نتیجہ بحث

اسلامی شریعت میں نکاح کی کوئی معین عمر مقرر نہیں کی گئی۔ شریعت نے صرف یہ شرط رکھی ہے کہ لڑکا اور لڑکی نکاح کی ذمہ داری اٹھانے کے قابل ہوں۔ بلوغت کے بعد نکاح کرنا جائز ہے، خواہ عمر 18 سال سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

ریاست کو نکاح کی عمر مقرر کرنے کا حق نہیں، کیونکہ یہ شریعت میں مداخلت ہے۔ ہاں، اگر کسی خاص وقت یا حالات میں عارضی طور پر کچھ پابندیاں لگانے کی ضرورت ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے، لیکن اسے دائمی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔

18 سال سے پہلے شادی بعض اوقات مسائل پیدا کر سکتی ہے، جیسے جسمانی ناپختگی، تعلیم میں رکاوٹ یا معاشی مشکلات۔ لیکن ان مسائل کا حل نکاح پر پابندی نہیں بلکہ شریعت کے اصولوں کی پابندی، والدین کی ذمہ داری اور معاشرتی اصلاح ہے۔

لہٰذا شادی کی عمر مقرر کرنا نہ تو شرعی طور پر درست ہے اور نہ ہی معاشرتی طور پر مفید۔ اس کے بجائے ہمیں چاہیے کہ:

نکاح کو آسان بنائیں، زبردستی کی شادیوں کو روکیں، تعلیم اور شعور کو عام کریں، اور نوجوانوں کو جائز طریقے سے اپنی ضروریات پوری کرنے کا راستہ دیں۔ اسلام کا مقصد آسانی اور سہولت فراہم کرنا ہے، تنگی اور مشقت نہیں۔ نکاح کو مشکل بنانا یا اس پر غیر شرعی پابندیاں لگانا معاشرے کے بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔

حوالہ جات

---

[1]) اکثر اسلامی ممالک میں جیسے مصر، کویت، عراق، اردن، مراکش، تیونس، عمان اور پاکستان میں صوبہ سندھ میں قانونی طور پر عمومی حدِ ۱۸ سال کی طرف رجحان واضح ہے، مگر زیادہ تر ممالک نے عدالتی استثناء، والدین کی رضامندی، یا مذہبی فرق کے ذریعے ۱۸ سے کم شادیاں قانونی طور پر ممکن بنا رکھا ہے، دیکھئے:
https://campaignforjustice.musawah.org/developments/minimum-and-equal-age-of-marriage /

[2]) أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني، الحجة على أهل المدينة، المحقق: مهدي حسن الكيلاني القادري، عالم الكتب، بيروت، ط:3، 1403، ج ،ص140، علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين: الهداية في شرح بداية المبتدي، المحقق: طلال يوسف، دار احياء التراث العربي، بيروت، لبنان، ج:1 ص193۔

[3]) شریعت کی رو سے چونکہ نابالغ و کمسن بچے اور بچی کا نکاح ہو جاتا ہے تاہم لڑکی کو بلوغت کی عمر تک پہنچنے پر نکاح کو باقی رکھنے یا ختم کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے اسے **خیار بلوغ** کہتے ہیں۔ حنفی نقطہ نظر کے مطابق لڑکی کو خیار بلوغ تب حاصل ہو گا جب اس کا نکاح باپ یا دادا کے علاوہ کسی اور نے (مثلاً ماں، بھائی، ماموں، چچا وغیرہ) کروایا ہو۔ تاہم اگر یہ نکاح باپ یا دادا میں سے کسی ایک نے کروایا ہو تو بالغ ہونے پہ لڑکی کو خیار بلوغ حاصل نہ ہو گا کیونکہ نابالغہ لڑکی پر باپ اور دادا کو ولایت اجبار حاصل ہوتی ہے۔
چنانچہ علامہ مرغینانی اپنی مشہور کتاب الهداية میں رقم طراز ہیں :
"فان زوجهما الاب و الجد يعنى الصغير و الصغيرة فلا خيار لهما بعد بلوغهما لانهما كاملا الراى وافر الشفقة فليزم العقد بمباشرتهما كما اذا باشراه برضاهما بعد البلوغ۔ وان زوجهما غير الاب و الجد فلكل واحد منهما الاخيار اذا بلغ ان شاء اقام على النكاح و ان شاء فسخ".
یعنی باپ اور دادا نے اگر دونوں (صغیر و صغیرہ) کا نکاح کر دیا ہو تو انہیں خیار بلوغ حاصل نہیں ہوتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ باپ اور دادا میں کامل شفقت موجود ہوتی ہے اور وہ کامل الرای ہوتے ہیں لہذا ان کا کیا ہوا نکاح لازم ہو گا (اسی کو ولایت اجبار کہتے ہیں بشرطیکہ کہ ان کا سوء الاختیار ہونا ثابت نہ ہو) اور اس صورت میں دونوں کو خیار بلوغ حاصل نہ ہو گا
(چاہے نکاح کا مہر غبن فاحش کے ساتھ ہی کیوں نہ قبول کیا ہو اور چاہئے غیر کفوء میں ہی کیوں نہ کر دیا ہو)۔ لیکن اگر باپ دادا کے علاوہ کسی اور نے نکاح کر دیا تو دونوں کو اختیار ہو گا کہ چاہے تو نکاح کو باقی رکھیں یا (خیار بلوغ کی وجہ سے) فسخ کر دیں۔ المرغيناني: الهداية في شرح بداية المبتدي، جلد:1 خ ص193۔
صاحب البحرالرائق اس مسئلے کے ضمن میں لکھتے ہیں:
"ولهما خيار الفسخ بالبلوغ في غير الأب والجد بشرط القضاء(أي للصغير والصغيرة إذا بلغا وقد زوجا)، أن يفسخا عقد النكاح الصادر من ولي غير أب ولا جد بشرط قضاء القاضي بالفرقة، وهذا عند أبي حنيفة ومحمد رحمهماالله ... بخلاف ما إذا زوجها الأب والجد؛ فإنه لا خيار لهما بعد بلوغهما؛ لأنهما كاملا الرأي وافرا الشفقة فيلزم العقد بمباشرتهما كما إذا باشراه برضاهما بعد البلوغ. تفصیل کے لئے دیکھیں:
زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري ، البحر الرائق شرح كنز الدقائق ، وفي آخره: تكملة البحر الرائق لمحمد بن حسين بن علي الطوري الحنفي القادري،وبالحاشية: منحة الخالق لابن عابدين ، دار الكتاب الإسلامي الطبعة: الثانية - بدون تاريخ، ج3، ص 128۔

[4]) محمد بن احمد بن ابی سہل ابو بکر شمس الدین السرخسی، **المبسوط**، دار المعرفہ، بیروت، ج: 4، ص 212، 213۔

[5]) محمد بن محمد الخطیب الشربینی، **مغنی المحتاج الی معرفۃ معانی الفاظ المنہاج**، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 2000، ج 4 ،ص246

[6]) نظام الدین، الفتاویٰ الہندیۃ المعروفۃ بالفتاویٰ العالمگیریۃ فی مذہب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 2000، ج، ص286.

[7]) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: مفتی رشید احمد لدھیانوی، أحسن الفتاوی، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی ، ط:اول، 1398ھ، ج 5، ص105 تا124.

[8]) السرخسی، **المبسوط**، ج: 4، ص: 224

[9] محمد بن الحسن الشیبانی، **الأصل**، وزارتِ اوقاف وامور اسلامیہ، دوحہ: 2014، جلد10، ص199، اور مصنف میں ہے:

"عَنِ الثَّوْرِيِّ، عَنْ حَبِيبِ بْنِ أَبِي ثَابِتٍ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ طَلْحَةَ قَالَ: قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: «لَأَمْنَعَنَّ فُرُوجَ ذَوَاتِ الْأَحْسَابِ إِلَّا مِنَ الْأَكْفَاءِ» دیکھیں: أبو بكر عبد الرزاق بن همام الصنعاني، المحقق: حبيب الرحمن الأعظمي، المصنف ويليه: كتاب الجامع لِلإمام معمر بن راشد الأزدي، رواية عبد الرزاق الصنعاني، المجلس العلمي - الهند، توزيع المكتب الإسلامي - بيروت، الطبعة: الثانية، ١٤٠٣هـ - ١٩٨٣، ج6، ص152۔

[10] السرخسی، المبسوط، جلد4، ص218.

[11] ابن عثیمین ذکر کرتے ہیں:

"ذكر بعض العلماء الإجماع على أن له أن يزوجها ... وقال ابن شبرمة من الفقهاء المعروفين: لا يجوز أن يزوج الصغيرة التي لم تبلغ أبداً؛ لأننا إن قلنا بشرط الرضا فرضاها غير معتبر، ولا نقول بالإجبار في البالغة فهذه من باب أولى، وهذا القول هو الصواب، أن الأب لا يزوج بنته حتى تبلغ، وإذا بلغت فلا يزوجها حتى ترضى"۔ دیکھئے: محمد بن صالح بن محمد العثيمين، كتاب الشرح الممتع على زاد المستقنع، دار النشر: دار ابن الجوزي، ط: الأولى، 1422 - 1428 -ج15، ص:57

[12] محمد بن احمد بن ابی سہل ابو بکر شمس الدین السرخسی، **المبسوط**، جلد:4، (بیروت: دار المعرفہ)، 212

[13] علامہ سرخسی نے ان حضرات کی دلیل کو ذکر کیا ہے جو نابالغی کے نکاح کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ انکی دلیل یہ ہے کہ اگر بلوغت سے پہلے نکاح جائز ہوتا تو پھر (بلوغت کے بعد نکاح ختم کرنے کے اختیار) کا کوئی فائدہ نہ رہتا۔ اور نابالغ لڑکی پر ولایت (اختیار اور سرپرستی) اس لیے دی گئی ہے کہ اسے ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جن کاموں میں ضرورت نہیں ہوتی وہاں سرپرستی بھی ثابت نہیں ہوتی، جیسے کسی کو بلا معاوضہ کچھ دے دینا (تبرعات) وغیرہ۔ اسی طرح نابالغ لڑکے اور لڑکی کو نکاح کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ نکاح کا فطری مقصد شہوت پوری کرنا ہے، اور شرعی مقصد اولاد کا حصول ہے، جبکہ کم عمری میں نہ شہوت کا مقصد پورا ہوتا ہے اور نہ اولاد کا مقصد۔ پھر نکاح ایسا معاہدہ ہے جو پوری زندگی کے لیے ہوتا ہے، اور اس کے احکام بلوغت کے بعد بھی لازم رہتے ہیں۔ اس لیے کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ نابالغ لڑکے یا لڑکی کو اس نکاح میں لازماً باندھ دے، کیونکہ بلوغت کے بعد ان پر کسی کی سرپرستی باقی نہیں رہتی۔ دیکھئے: السرخسی، المبسوط ج4، ص212۔

[14] اسلامی نظریاتی کونسل، سالانہ رپورٹ ۲۰۱۳-۲۰۱۴، ص161

[15] امام سرخسی لکھتے ہیں: وَلَوْ زَوَّجَ الْأَبُ ابْنَتَهُ الصَّغِيرَةَ مِمَّنْ لَا يُكَافِئُهَا أَوْ زَوَّجَ ابْنَهُ الصَّغِيرَ امْرَأَةً لَيْسَتْ بِكُفْءٍ لَهُ جَازَ فِي قَوْلِ أَبِي حَنِيفَةَ اسْتِحْسَانًا، وَلَمْ

يَجُزْ عِنْدَهُمَا، وَهُوَ الْقِيَاسُ، وَكَذَلِكَ لَوْ زَوَّجَ ابْنَتَهُ بِأَقَلَّ مِنْ صَدَاقِ مِثْلِهَا أَوْ ابْنَهُ بِأَكْثَرَ مِنْ صَدَاقِ مِثْلِهَا بِقَدْرِ مَا لَا يَتَغَابَنُ النَّاسُ فِيهِ لَا يَجُوزُ عِنْدَهُمَا، هَكَذَا قَالَ فِي الْكِتَابِ .....وَلَكِنَّ الْأَصَحَّ أَنَّ النِّكَاحَ لَا يَجُوزُ، هَكَذَا فَسَّرَهُ فِي الْجَامِعِ الصَّغِيرِ. دیکھیں: المبسوط، ج4، ص224۔

[16] اسلامی نظریاتی کونسل، سالانہ رپورٹ ۲۰۱۳-۲۰۱۴، ص161

[17] مسماۃ ممتاز بی بی بنام قاسم و دیگر (رٹ پیٹیشن نمبر 4227 مجریہ 2021ء)

[18] عبد الرزاق بنام سرکار و دیگر (2022 پی سی آر ایل جے 953۔ اسلام آباد)

"It is settled principle of Shariah if any Mobahact appears to be harmful to the society collectively or to a particular segment of a society, the State has power to make that act prohibited so that the society can be protected from a larger damage. Many examples of such actions taken by the Muslim State are available in the historical record. One such example is of Hazrat Umar (R.A), the second caliph of Islam Kitabladies, although in Shariah it is legally (jaiz) or (Mubah) permitted but for the larger interest of the Muslim community of the Muslim State at that particular time, Hazrat Umar (R.A) prohibited such marriages. In addition to that Hazrat Umar (R.A) took several steps in which under special circumstances, he hokum setting starten on a Mubah) act in such a precautious way that it does not affect any other hokum set out by Shariah. The setting of the minimum age limit of 16 for girls is one of such examples.

[19] (it is not only balughat/puberty but also rushd, which is the second important criteria for a person to enter into Nikah. According to the Dictionary of Modern Written Arabic by Hans Wehr, the word 'Rushd' has been

explained/defined as integrity of (one's) actions, proper, sensible conduct; reason, good sense, senses; consciousness; maturity (of the mind). Meaning thereby a person who has attained puberty and he/she can form good decision and have maturity of mind can contract".

[20])سید ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، 2023، ج4، ص323 .

[21])ابو القاسم محمود بن عمر الزمخشری، الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل وعيون الأقاويل في وجوه التأويل، دار الكتاب العربي، بیروت، 1987، ج1، ص 573

[22]) قاضی محمد ثناء اللہ العثمانی الحنفی المظہری النقشبندی، تفسير المظهري، دار إحياء التراث العربي، بیروت، 2004، ج2، ص 223

[23])ابو البرکات عبد اللہ بن احمد بن محمود، مدارك التنزيل وحقائق التأويل، دار تحقیق الکتاب، استنبول، س ن، ج3، ص 4-6

[24]) قال الشوكاني رحمه الله تعالى:وقد اختلف أهل العلم في معنى الرشد هاهنا فقيل : الصلاح في العقل والدين وقيل : في العقل خاصة ، قال سعيد بن جبير والشعبي : إنه لا يدفع إلى اليتيم ماله مالم يؤنس رشده ، وإن كان شيخا ، قال الضحاك : وإن بلغ مائة سنة ، وجمهور العلماء على أن الرشد لا يكون إلا بعد البلوغ ، وعلى أنه إن لم يرشد لايزول عنه الحجر وقال أبو حنيفة والنخعي وزفر لا يحجر على الحر البالغ وإن كان فاسقا مبذرا.

تفصیل کے لئے دیکھیں: اختيارات الإمام الشوكاني في التفسير من خلال كتابه « فتح القدير» من أول الكتاب إلى آخر سورة الإسراء، عرض ودراسة، رسالة مقدمة لنيل درجة العالمية العالية (دكتوراة) إعداد:علي بن حميد بن مسلم السناني ، إشراف: فضيلة الدكتور / محمد بن بكر بن إبراهيم آل عابد ، المملكة العربية السعودية وزارة التعليم العالي ،الجامعة الإسلامية بالمدينة المنورة ،كلية القرآن الكريم - قسم التفسير، العام الدراسي 1419 1418هـ، ص 394

[25]) ایضا

[26]) فاروق عمر بھوجا بنام فیڈریشن آف پاکستان)شرعی درخواست نمبر10/1برائے2020۔

"It is settled principle of Shariah if any Mobahact appears to be harmful to the society collectively or to a particular segment of a society, the State has power to make that act prohibited so that the society can be protected from a larger damage."

[27]) فاروق عمر بھوجا بنام فیڈریشن آف پاکستان)شرعی درخواست نمبر10/1برائے2020

[28]) د ابن النجار الدمياطي، أبو عمار ياسر بن أحمد بن بدر النجار الدمياطي، موسوعة الفقه على المذاهب الأربعة مع أدلتها التفصيلية من الكتاب والسنة النبوية راجعه: مجمع البحوث الإسلامية بالأزهر الشريف ، دار التقوى، القاهرة – مصر ، الطبعة: الأولى (التامة)، ١٤٤٤ هـ - ٢٠٢٣ ، ج14، ص 30

[29])ایضاج14ص32.

[30]) ابن نجیم، الأشباه والنظائر على مذهب أبي حنيفة النعمان (بیروت: دار الكتب العلمية، 1999)، 104۔

[31])ابو حامد محمد بن محمد الغزالي، المستصفى من علم الأصول، دار الكتب العلمية، بیروت، 1413ھ، 174۔

[32]) معنى مصطلح "مقاصد الشريعة" باعتباره لقبًا: وبهذا الاعتبار ذكر له العلماء عددا من المعاني، منها:

أ- هي المعاني والحكم الملحوظة للشارع في جميع أحوال التشريع أو معظمها. بحيث لا تختص ملاحظتها بالكون في نوع خاص من أحكام الشريعة.

ب- وقريب من ذلك قولهم: هي المعاني والحِكَم ونحوها التي راعاها الشارع في التشريع عمومًا وخصوصًا، من أجل تحقيق مصالح العباد-----الخ

تفصیل کے لئے ملاحظ فرمائیں: مجلة البحوث الإسلامية - مجلة دورية تصدر عن الرئاسة العامة لإدارات البحوث العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد، المؤلف: الرئاسة العامة لإدارات البحوث العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد، ج 95، ص 312.

[33]) البقرة: 275

[34]) النساء: 3

[35]) ابن نجیم، الأشباہ والنظائر علی مذھب أبي حنیفۃ النعمان، دار الکتب العلیۃ، بیروت:1999، ص 56۔

[36]) البقرۃ:29

[37]) محمد بن عبد اللہ الخطیب التبریزی، مشکاۃ المصابیح، مکتبۃ البشریٰ، کراچی، 2010، ج1، ص 187۔ اس اصول سے متعلق مزید اور صریح دلائل قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات بھی ہیں: قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ (الأنعام:145)۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا کہ وحی کے دائرے میں چند مخصوص چیزوں کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں پائی جاتی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تحریم کا اختیار محض وحیِ الٰہی تک محدود ہے، اور اس دائرے سے باہر کسی چیز کو ممنوع قرار دینا دراصل شریعت میں اضافہ کے مترادف ہے۔

اسی مفہوم کی مزید تاکید سورۃ التحریم کی آیت سے ہوتی ہے: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ (التحریم:1)

یہاں خود نبی کریم ﷺ کو بھی کسی مباح چیز کو اپنے اوپر حرام کرنے پر متنبہ کیا گیا، حالانکہ یہ تحریم تشریعی نہ تھی بلکہ ذاتی نوعیت کی تھی۔ جب نبی ﷺ کو بھی مباح کو حرام ٹھہرانے کی اجازت نہیں، تو کسی حاکم یا ریاست کو بدرجہ اولیٰ یہ حق حاصل نہیں کہ وہ شرعاً مباح کو مستقل طور پر ممنوع قرار دے۔

قرآن کریم ایک اور مقام پر تحریم کے اس غیر شرعی رویے کو سخت الفاظ میں رد کرتا ہے: وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ (النحل:116)، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حلال و حرام کے تعین میں تجاوز کرنا افتراء علی اللہ کے زمرے میں آتا ہے، جو ایک سنگین جرم ہے۔ لہٰذا کسی مباح امر پر کلی پابندی لگانا، اگر وہ نصِ قطعی سے ثابت نہ ہو، شرعاً محلِ نظر ہے۔

[38]) ابن نجیم، الأشباہ والنظائر ،دار الکتب العلمیۃ، بیروت، 1999، ص 73۔

[39]) ایضا:78

[40]) مباح کی ان اقسام اور تقیید المباح سے متعلق اہم ترین اس بحث کی تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: سجل البحوث وأوراق العمل لمؤتمر الجماعة والإمامة .. جامعة الامام محمد بن سعود، المملكة العربية السعودية أنموذجاً، ج: 5، ص 3473.

[41]) العلامة إسحاق إبراهيم بن موسى بن محمد التيجي الشاطبية، الموافقات ، دار ابن عفان للنشر والتوزيع المملكة العربية السعودية - الخبر، الطبعة: الأولى، ١٤١٧هـ / ١٩٩٧م، ج 2، ص 9

[42]) ابن نجیم، الأشباہ والنظائر، دار الکتب العلیۃ، بیروت، 1999، ص 104۔

[43]) البخاری، صحیح البخاری، ج7، ص 208، حدیث نمبر5423۔

[44]) البقرۃ،2:275

[45]) النساء:6

[46]) البقرۃ،:229

[47]) البقرۃ،172

[48]) ابن نجیم، الأشباہ والنظائر،134۔

[49]) محمد مصطفیٰ الزحیلی، القواعد الفقهية وتطبيقاتها في المذاهب الأربعة، دار الفكر، دمشق، 2009، ص 488۔

[50]) احمد بن محمد الزرقا، شرح القواعد الفقهية، تعليق: مصطفى احمد الزرقا، دار العالم، بیروت:1989، ص: 313۔